بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جو لوگ مسلمانانِ پاک و ہند کے دینی مزاج، اخلاقی شعور اور اُن کے اندر پیدا ہونے والے تغیرات کا تھوڑا سا بھی علم رکھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ غیر ملکی علوم و فنون کی یلغار کے نتیجہ میں اُبھرنے والی عقلیت پرستی کی تحریک نے ایک طبقے کو کافی حد تک مرعوب و متاثر تو کیا لیکن وہ اسے اسلام کا باغی نہ بنا سکی۔ اسی طرح مغربی تہذیب و تمدن کی یورش سے مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے اندر اخلاقی بگاڑ تو بلاشبہ رونما ہوا لیکن عوام میں اسلامی اقدار کا احترام بدستور باقی رہا اور اخلاقی بگاڑ کوئی ہمہ گیر و بائی صورت اختیار نہ کر سکا۔ مگر اس انحطاط کو بھی مسلمانوں کے حساس بہی خواہوں نے بالکل آغاز ہی میں پوری شدت سے محسوس کر کے اس ناپاک عمل کو روکنے اور حالات کو رُو بہ اصلاح کرنے کے لیے اپنی بساط کے مطابق کوششیں شروع کر دیں۔ اہلِ علم کے ایک گروہ نے پوری قوتِ استدلال کے ساتھ مغربی تہذیب کا فسوں توڑا، دوسرے گروہ نے بڑے علمی انداز میں دیگر مذاہب پر اسلام کی برتری ثابت کی، تیسرے گروہ نے جگہ جگہ دینی مدارس قائم کر کے قرآن و سنت کی تعلیم کو عام کیا۔ یہ مدارس مغربی تہذیب کے طوفان میں ایمان کی سلامتی کے لیے کشتیٔ نوح ثابت ہوئے۔ مسلم علماء کے ایک گروہ نے اسلام کے بارے میں غیروں کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں سے مسلمانوں کے دل و دماغ کو صاف کیا اور دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کی کہ صرف اسلام ہی دین حق ہے۔ مسلمان مؤرخین نے اسلامی تاریخ کے رُخِ روشن سے پردہ ہٹا کر اُمتِ مسلمہ کو اپنے تابناک ماضی سے آشنا کیا۔ پورے ملک میں بہت سی اصلاحی انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے تاکہ اہلِ ایمان کی نئی نسل کو

نام نہاد جدید تہذیب و تمدن کی دست برد سے بچایا جا سکے۔

مسلمان رہنماؤں اور ملت کے ان خیر خواہوں کی کاوشوں کے نتیجہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کے اندر یہ اُمنگ پیدا ہوئی کہ انہیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ ان خطوط پہ استوار کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کیے ہیں۔ چنانچہ آزادی وطن کی ہر تحریک میں مسلمانوں نے اسی جذبے سے سرشار ہو کر بھرپور حصّہ لیا۔ تحریکِ خلافت اور تحریک پاکستان اسی پاکیزہ جذبے کا عملی اظہار تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب کوئی قوم اس مقدس آرزو کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہو تو اس کے اندر غیر اسلامی تحریکات پرورش نہیں پا سکتیں۔ چنانچہ تحریکِ خلافت سے لے کر قیام پاکستان تک مسلم قوم کے اندر جنم لینے والے لادین عناصر کی اوّل تو تعداد ہی بہت کم رہی اور جو تھے بھی، وہ بالکل دبے رہے اور انہیں کسی مرحلہ پر بھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ کھُل کر دینِ حق کے خلاف کوئی شرانگیزی کر سکیں۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے کے بعد جب مسلمانوں کو یہ موقع فراہم ہو گیا کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق تشکیل دیں تو ان کی صفوں میں چھپے ہوئے اعدائے دین لنگر لنگوٹے کس کر سامنے آگئے اور اس بات کے لیے کوشاں ہوئے کہ مسلمانوں کا یہ عزم کسی طرح پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے پائے۔ انہوں نے اپنی اس ناپاک جدوجہد کے لیے چار میدان خاص طور پر منتخب کیے: ذرائع ابلاغ، بیوروکریسی، مزدور انجمنیں اور ثقافتی ادارے۔ لاہور میں پاکستان ٹائمز اور امروز کے دفاتر لادینی سرگرمیوں کے خصوصی مراکز بنے۔ ملک کے اندر جس قدر ریڈیو اسٹیشن قائم تھے ان سب پہ ایک گہری سازش کے ذریعے یہ سُرخ عناصر پوری طرح قابض ہو گئے۔ مزدوروں کے اندر انہوں نے ایسی نمائشی تنظیمیں قائم کرلیں جن کی غرض و غایت مزدوروں کے حقوق کا تحفظ نہ تھا بلکہ آجر و اجیر کے درمیان پیہم تصادم کی صورت پیدا کر کے سرخ انقلاب کی راہ ہموار کرنا تھا۔ ثقافتی انجمنوں اور اداروں نے ان لادین عناصر کی سرپرستی میں عوام، خصوصاً نوجوان نسل کو اخلاقی طور پہ بگاڑنے کی سرتوڑ کوششیں شروع کردیں۔ پھر اُن کا ایک طبقہ حزبِ اختلاف کا دمساز بن کر اور دوسرا حکومت کے ایوانوں میں کلیدی آسامیوں پہ مسلط ہو کر راعی اور رعایا

کے تعلقات مسلسل خراب کرتا رہا۔ ہمارے ملک کے حکمران چونکہ شروع ہی سے ان بے دین عناصر کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اُن کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے حکمرانی کے آمرانہ طور طریقے اپنانے کی کوشش کی۔ ان فرمانرواؤں کی یہ غلط اور عاقبت نااندیشانہ روش چونکہ دین کے ان دشمنوں کے لیے سودمند تھی اس لیے انہوں نے پاکستان کے سربراہوں کو کبھی راہِ راست پر نہ آنے دیا۔ پاکستانی عوام کی اسلام سے گہری عقیدت اور جذباتی لگاؤ کو دیکھ کر اشتراکی دانشور اس بارے میں قطعاً پُر اُمید نہ تھے کہ انہیں چند سالوں میں اشتراکیت کا حلقہ بگوش بنا لیں گے لیکن اس بات سے کافی حد تک مطمئن تھے کہ اگر وہ حکمران طبقہ میں پوری یکسوئی سے کام کرتے رہے تو انہیں اس میں سے ایسی معتدبہ تعداد ضرور دستیاب ہو جائے گی جو اگرچہ اسلام کی کھلی دشمن تو نہ ہو لیکن دینِ حق سے یکسر بیگانہ اور کفر و الحاد کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھنے والی ہوگی جو حکمران اپنے دل میں آمرانہ عزائم پالتے ہوں خوشامد اُن کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ ہر لمحہ اس بات کے آرزومند رہتے ہیں کہ کچھ لوگ اُن کے کانوں میں خوش کُن باتیں ڈالتے رہیں۔ اس ملک کے بے ضمیر اور لادین عناصر بڑی آسانی سے انہیں شیشے میں اُتار کر اُن سے نہ صرف اپنے لیے اور اپنے ہم مسلک افراد کے لیے ہر قسم کی دُنیوی مراعات حاصل کرتے رہے بلکہ انہوں نے حکمرانوں کو ہر معقول اور منصفانہ قدم اُٹھانے سے بھی باز رکھا تاکہ کہیں عوام میں مقبول ہو کر اِن عناصر کی مدح و ستائش اور معاونت و دستگیری سے بے نیاز نہ ہو جائیں اور اس راہ پر نہ چل نکلیں جسے اسلام نے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا ہے اور جس پر چلنے کے لیے مسلمانوں نے ایک الگ خطۂ ارض کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ دین دشمن عناصر شروع ہی سے پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھ رہے تھے اور انہیں اپنی قوت اور عوام میں اپنے اثر و نفوذ کا اس قدر زیادہ غرّہ تھا کہ انہوں نے فوجی سازش کے ذریعے اشتراکی اقلیت کو مسلم اکثریت پر بالجبر مسلط کرنے کی کوشش کی لیکن قادرِ مطلق نے ان ناپاک منصوبوں کو یکسر خاک میں ملا دیا اور یہ ملک خونی انقلاب کی تباہ کاریوں سے بچ گیا۔

اس مسلح سازش کی ناکامی کے بعد مارکس اور لینن کے ان پرستاروں کو اپنی قوت کا صحیح اندازہ ہو گیا اور اُن کے سامنے یہ حقیقت بھی کھل کر آ گئی کہ وہ اس ملک پر کسی فوجی انقلاب کے ذریعے قابض نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے انہوں نے ایک طرف تو ثقافتی اور معاشی میدانوں میں اپنی تخریبی کاروائیاں زور شور سے

شروع کر دیں اور دوسری طرف شاہ کے مصاحبین بن کر ملک کے اندر لادین قوتوں کو اُبھارنے اور منظم کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کی دین کے خلاف سازشوں اور معاندانہ سرگرمیوں کے نتائج ہماری زندگی کے ہر گوشے میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔

آپ قیامِ پاکستان سے لے کر اس وقت تک کے حالات پر غور کریں تو آپ یہ بات شدت سے محسوس کریں گے کہ جو سرزمین اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کی گئی تھی وہ آہستہ آہستہ کفر و الحاد، اشتراکیت اور فسق و فجور کی آماجگاہ بنتی جا رہی ہے۔ اِس ملک کے آئین کے بارے میں یوں تو شروع ہی سے ایک الجھاؤ پیدا کیا گیا اور مغرب زدہ طبقوں نے شرارت کے طور پر اس خدشہ کا اظہار شروع کر دیا کہ چودہ سو برس پرانا دستور دورِ جدید کے مملکتی تقاضوں کو آخر کس طرح پورا کر سکتا ہے؟ اُن کے الفاظ سے اسلامی دستور کے عہدِ جدید میں دوسرے دساتیر پر تفوق و برتری کے بارے میں شکوک و شبہات برابر پیدا ہوتے رہتے تھے مگر وہ جس چیز پر زور دیتے تھے وہ اِس قدر تھی کہ اس دستور کے اندر حالات کے مطابق تغیر و تبدل کر دیا جائے۔ اُس وقت اس ملک کے کسی طبقے کی ہمت نہ تھی کہ وہ اسلامی نظام کے کسی ایک حصّے کو بھی مسترد کر کے یہاں کفر کی عملداری قائم کرے۔ اس زمانے میں نظامِ شریعت کے خلاف سب سے خوفناک سازش جو کی جا سکی وہ سنت کی آئینی حیثیت کو مشتبہ بنانا تھا۔ لیکن علمائے حق کی کوششوں سے یہ فتنہ آغاز ہی میں دب کر رہ گیا اور اُمت کے اجتماعی ضمیر نے اسے کسی حیثیت سے بھی بڑھنے اور پھیلنے نہ دیا۔

ملک غلام محمد کے عہدِ اقتدار میں جب ملک کی سیاسی زندگی زیر و زبر ہوئی اور اُسے عوامی حمایت کھو کر ایک خاص طبقے کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو اس کے اِرد گرد چند ایسے دانشور جمع ہو گئے جو اگرچہ کافر تو نہ تھے مگر دلدادۂ فرنگ ہونے کی وجہ سے اسلام سے دُور اور مغرب کے کافرانہ نظامِ زندگی کے قریب تر تھے۔ خصوصاً مغربی معاشرت انہیں بہت پسند تھی اور وہ اس کا کھلے بندوں اظہار بھی کرتے تھے۔ اِن فرنگیت مآب اور حکومت میں دخیل اہلِ ہنر کی سرپرستی میں کفر کو آگے بڑھنے کے بڑے مواقع فراہم ہوئے۔ انہوں نے ثقافت کے نام پر فسق و فجور کو خوب پھیلایا اور اِس طرح

ملحدانہ افکار و نظریات مسلم معاشرے میں جڑ پکڑنے لگے۔ ایمان اور پاکبازی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح الحاد اور فسق و فجور میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس دل میں ایمان کی حرارت ہوگی وہ لازمی طور پر نیکی کی طرف ہی راغب ہوگا اور جو شخص فسق و فجور میں مبتلا ہوگا اُسے کفر ہی راس آئے گا، جس معاشرے میں بے حیائی پھیلتی ہے اس میں ضبطِ نفس کے بندھن ٹوٹتے ہیں، حق و باطل کا امتیاز مٹتا ہے اور کفر اسے ترنوالہ سمجھ کر بڑی آسانی سے نگل جاتا ہے۔

سکندر مرزا کے دورِ حکومت میں بھی ملک کے اندر فحاشی کا دائرہ مسلسل پھیلتا رہا اور کفر و الحاد کو معاشرے کے مختلف طبقوں خصوصاً اونچے طبقے یا حام خور طازمین کے اندر نفوذ کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ یہ شخص اپنی روایتی نااہلی اور سیاسی شعور کے فقدان کی وجہ سے نوکر شاہی کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی تھا۔ خاص طور پر وہ سرکاری عہدیدار جو اس کے ساتھ براہ راست وابستہ تھے وہ اس سے جو کام چاہتے بآسانی لے لیتے۔ اسلامی اقدار، ان کے احترام اور اُن کی پابندی کے لحاظ سے مسلم معاشرے کی صورتِ حال مسلسل بگڑتی رہی۔ سیاسی اور معاشی خلفشار اور ملک کے نظامِ تعلیم میں کربناک انتشار اور نظم و نسق میں خوفناک ابتری نے تخریب پسند قوتوں کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء میں دین سے بغاوت کے جو رجحانات ایک نہایت ہی محدود سے طبقے میں نظر آتے تھے اور جن کی وجہ سے یہ طبقہ اپنے آپ کو امت سے بے تعلق سا محسوس کرتا تھا وہ معاشرے کے دوسرے طبقوں میں بھی پھیلنے لگے۔ اس وقت اس امر کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ ان باطل افکار سے کتنے فیصد لوگوں نے کس حد تک اثر قبول کیا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے دلوں میں کفر و الحاد کے خلاف جو شدید نفرت تھی اُس کی شدت کسی حد تک کم ہو گئی اور وہ ملحد طبقوں سے جو بُعد و بیگانگی محسوس کرتے تھے وہ غیر شعوری طور پر مداہنت میں تبدیل ہونے لگی۔

ملک غلام محمد اور سکندر مرزا کے دورِ اقتدار میں اس ملک کے اندر دینِ حق کو جو نقصان پہنچا تاریخ کا کوئی طالب علم اس سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہ دونوں فرمانروا اکبر کی طرح دین کا کوئی ایسا تصور نہ رکھتے تھے جسے وہ پاکستان میں حکومت کی قوتِ نافذہ کے ذریعے عوام پر

مسلط کرنا چاہتے ہوں۔ وہ دین کے بارے میں اپنے کوئی خاص عزائم بھی نہ رکھتے تھے جن کی تکمیل کے لیے انہیں اقتدار کی ضرورت لاحق ہو۔ اُن کی سیرت و کردار اور اُن کی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں اور محلاتی سازشوں کو دیکھ کر اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نشۂ اقتدار کی خاطر مسندِ اقتدار سے طویل عرصے کے لیے چمٹا رہنا چاہتے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں اقتدار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ہمارے اس ملک میں جو حکمران ایک بگڑے ہوئے مغل فرمانروا کی طرح دین کے بارے میں اپنے مخصوص تصورات اور اجتماعی زندگی کا مخصوص نشہ ذہن میں رکھ کر تختِ اقتدار پہ قابض ہوا وہ محمد ایوب خاں تھا۔ جن لوگوں نے اس کی کتاب فرینڈز ناٹ ماسٹرز مطالعہ کی ہے وہ اس کے دینی رجحانات، اسلامی تعلیمات کے بارے میں اُس کے ذاتی خیالات اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کے متعلق اس کے ارادوں سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اسلام کا دشمن تو نہ تھا لیکن اسلامی تعلیمات کے اندر ایسی تبدیلیاں کرنا چاہتا تھا جن سے پاکستان میں دین کا نام تو رہے لیکن جو اجتماعی نظام قائم ہو وہ اس ملک کو کمال اتاترک کاٹرکی بنا دے۔ چنانچہ اس شخص نے اسلامی نظام کی اساس منہدم کرنے کی غرض سے سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑے عامیانہ انداز میں حملے کیے۔ اس کا ایک خطبۂ صدارت جو اس نے اُونچے فوجی افسروں کے ایک خاص اجتماع میں دیا وہ اس کے اصل عزائم کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ اُس میں سنّت کی آئینی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے پہلے تو راویوں اور اندازِ روایت کا مذاق اُڑاتا ہے پھر تمسخر کے انداز میں کہتا ہے جب اکبر اور جہانگیر کے حالات صحت کے ساتھ قلمبند نہیں کیے جا سکتے جو نسبتاً قریب کے دَور کے حکمران ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے کے کسی شخص کے سوانح من و عن احادیث و سیر کی کتابوں میں محفوظ ہوں۔ اس ضمن میں فیلڈ مارشل صاحب نے عربوں پر ایک الزام یہ بھی عاید کیا کہ ان لوگوں کی قوتِ متخیلہ بہت تیز ہے اس لیے بہت کچھ زیبِ داستان کے لیے بڑھا لیتے ہیں۔ پھر اس شخص نے اس کتابچہ میں وقت کے تقاضوں کا بھی بڑے شد و مد کے ساتھ ذکر کیا اور مذہب کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی کی کہ مذہب انسان کے لیے ہے نہ کہ انسان مذہب کے لیے، اس لیے مذہب کو انسان اور اُس کی ضروریات کے تابع رہنا چاہیے۔

جب پاکستان میں ہمہ مقتدر شخصیت کے دینی افکار و نظریات یہ ہوں تو وہاں کیا باطل کو کھل کھیلنے کے مواقع فراہم نہ ہوں گے؟ چنانچہ اس آمر مطلق کے عہد میں اسلام دشمن طاقتوں نے دینِ حق کا راستہ روکنے اور الحاد کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور دینی طبقوں کو معاشرے میں بے وقعت اور غیر مؤثر بنانے کے لیے انتہائی کوشش کی۔ حکومت نے ملک کے لادین عناصر کو دین کی بیخ کنی کے لیے جو سازگار ماحول عطا کیا اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ پہلے سے زیادہ منظم اور مستعد ہوئے اور انہیں اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل میں خاصی کامیابی بھی ہوئی۔ ہمارے نزدیک لادین عناصر کے لیے ایوب خان کا دورِ اقتدار انعام و اکرام کا دور تھا جس میں ان پر ہن بھی خوب برسا اور حکومت کے ایوانوں میں بھی اُن کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ پھر اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلم معاشرے کی دینی بنیادیں ڈھا کر اسے از سرِ نو کفر و الحاد کی نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اعدائے دین کے ہاتھ میں سنت کی مخالفت کی صورت میں ایک کارگر ہتھیار تھما دیا گیا۔ چنانچہ دیکھیے اسلام دشمن قوتوں نے سنّت کی آئینی حیثیت کو جس قدر شدت کے ساتھ ایوب خان کے دور میں چیلنج کیا اس قدر کسی دوسرے دور میں نہیں کیا۔

یحییٰ خان کا دورِ حکومت دینی نقطۂ نظر سے ملک غلام محمد اور سکندر مرزا کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اِس شخص کے دین کے بارے میں کوئی عزائم اور تصورات نہ تھے۔ اقتدار سے اس کی ایک ہی غرض وابستہ تھی کہ وہ ملک کے سیاہ و سپید کا مالک ہو، اس کے وسیع ذرائع و وسائل تنہا اس کے قبضہ میں ہوں اور انہیں وہ اپنی عیش پرستیوں کے لیے جس طرح چاہے خرچ کرے اور کوئی اس سے باز پرس نہ کر سکے۔ ملک میں اس اندوہناک صورت حال سے بھی لادین عناصر ہی کو فائدہ پہنچا۔

پاکستان میں کھل کر مادہ پرستانہ نظریات کے ساتھ اشتراکیت کی عملداری قائم کرنے کے لیے جو شخص گہری سازش کے ذریعے تختِ اقتدار پر قابض ہوا وہ ذوالفقار علی بھٹو ہے۔ اس نے ایک اشتراکی ملک کی عوامی جماعت کے نام پر ایک جماعت کی بنیاد رکھی۔ ہٹلر نے (باقی بر صفحہ ۶۴)

(بقیہ اشارات) جن خطوط پر اپنی پارٹی کی تشکیل کی تھی انہیں خطوط پر اس نے پیپلز پارٹی کو منظم کیا۔ اس نے پارٹی کے لیے جو نعرہ تجویز کیا اُس سے دین کے دو تہائی حصّے کی برملا نفی کی گئی۔ بھٹو صاحب سے پہلے کسی عوامی رہنما کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ اس ملک کے نظامِ حیات کے بارے میں یہ کہتا کہ "اشتراکیت ہماری معیشت ہے" اور دین زندگی کے صرف مذہبی گوشے تک محدود ہے۔ پھر اس نے اپنی جماعت میں اہم عہدوں پر تو بڑے بڑے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو فائز کیا مگر غریبوں کو بیوقوف بنا کر اپنے پیچھے لگانے کے لیے ان کی ہمدردی میں آنسو بہائے۔ لوگ بھٹو صاحب کی اِس عیاری کو اِن کے گہرے تاریخی شعور سے تعبیر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ ذہنی منافقت اور بے کسوں کے ساتھ شرمناک مذاق ہے۔ اگر اس دھوکہ بازی کو کوئی شخص تاریخی شعور سمجھتا ہے تو پھر ہٹلر اور مسولینی بھٹو صاحب سے کہیں زیادہ باشعور تھے۔ اس تاریخی شعور نے اُن آمروں اور اُن کے پیروکاروں کو جس المناک انجام تک پہنچایا اُسے نگاہ میں رکھ کر ذرا سوچیے کہ اس گہرے شعور کا مالک سیاستدان کیا اپنے لیے اسی انجام کو پسند کرتا ہے؟ تاریخی شعور عوام کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے اور اُن کے سطحی جذبات سے شرمناک کھیل کھیلنے کا نام نہیں بلکہ تاریخ کی روشنی میں کسی قوم کے لیے ایسا طرزِ فکر متعین کرنے اور ایسا اسلوبِ حیات ترتیب دینے کا نام ہے جو اسے ہلاکتوں سے بچا کر فلاح و کامرانی کی راہ پر گامزن کر سکے۔

برناڈ شا نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جو شخص ایک پونڈ کی چوری کرے وہ چور کہلاتا ہے اور جو ایک لاکھ پونڈ ہتھیا لے اُسے فنکار کہا جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی المیہ ہماری موجودہ تاریخ کا ہے کہ اگر کوئی فرد کسی شخص کی غفلت، جہالت اور بے بسی سے فائدہ اُٹھا کر اُسے لوٹ لے تو وہ خائن اور مجرم گردانا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مکار اور عیار سیاستدان اپنی چرب زبانی اور دلفریب نعروں کے بل پر پوری قوم کو بیوقوف بنا کر اس سے ہر قسم کے ناجائز مفادات حاصل کر لے تو وہ قوم کا نجات دہندہ بن بیٹھتا ہے۔

مسٹر بھٹو نے ایک طرف تو قوم کے جذبات کو بھڑکایا، اس کے اندر طبقاتی منافرت اور کشمکش پیدا کی اور دوسری طرف جمہوریت کے نام پر جمہوریت کا خون کیا۔ ایوب خان کے دورِ اقتدار میں بحالیٔ جمہوریت کی جو تحریک چلی تھی اس میں اسے اس امر کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ اگر مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ساتھ رہیں تو اس ملک میں آمریت کا تسلط قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی خطے کی وسعت، خصوصاً جب اس کے دو حصوں کے درمیان ہزار میل کا فاصلہ حائل ہو، آمریت کی راہ کا سنگِ گراں ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے اپنی آمریت کے قیام کے لیے پاکستان کے مشرقی بازو کو مغربی بازو سے الگ کر کے بنگلہ دیش کی صورت میں ایک نیا ملک بنانے کی سازش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مغربی پاکستان میں نوکر شاہی کی مدد سے ایک نہایت ہی ظالمانہ قسم کی آمریت قائم کی۔ اشتراکیت چونکہ ایک غیر فطری نظامِ حیات ہے اس لیے کسی ملک میں اس کو خوشدلی سے قبول نہیں کیا گیا اسے جہاں بھی نافذ کیا گیا وہاں عوام کے منشا کے علی الرغم بالجبر نافذ کیا گیا۔ دہشت، غنڈہ گردی، جبر و تشدد اور قتل و غارت اس نظام کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں اشتراکیت کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ بے دین طبقوں نے حکومت کی شہ پا کر دینِ حق کے خلاف اپنے دل میں چھپے ہوئے کینوں کا برملا اظہار کیا اور اسلامی اقدار کا کھلے بندوں مذاق اڑایا۔ رشوت خوری، چور بازاری، ظلم و زیادتی اور زیر دست آزاری کی سرکاری سطح پر سرپرستی کی گئی تاکہ عوام سراسیمہ ہو کر ان قدروں کو خود ہی پامال کرنا شروع کر دیں جنہیں وہ اب تک عزیز رکھتے تھے اور جن کی بدولت ان کا ملی تشخص قائم تھا۔ ملک میں غریبوں کی ہمدردی کے نام پر معاشی استبداد کے ایک نئے دور کا آغاز کیا گیا۔ جس سے صنعتیں تباہ ہو گئیں اور افراط زر میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس طرح معاشی زندگی میں جان بوجھ کر ایک ایسا خوفناک تعطل پیدا کیا گیا جو ملکی ذرائع پیداوار کو پوری طرح نمو پائے بغیر کسی طرح دور کرنا ممکن نہ تھا — افراتفری، شدید اضطراب اور بے یقینی کی اس فضا میں جب لوگوں کے لیے جینا تو کیا سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا ہو عوام اپنے نظامِ حیات میں ہر قسم کی تبدیلی قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جس طرح کوئی بے دین ظالم جب کسی شریف انسان کے حلق سے کوئی حرام شے زبردستی اتارنے کا تہیہ کر لے تو اس کے لیے سب سے پہلے اسے ہر حلال چیز سے محروم کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ

بے بسی کے عالم میں حرام کھانے پر مجبور ہو جائے اسی طرح بھٹو صاحب نے ملک کے اندر دہشت گردی، نفسا نفسی اور خود غرضی کا ایک ایسا گھناؤنا ماحول پیدا کر دیا جس میں لوگ مجبوراً اشتراکیت کی طرف کھچے چلے جائیں۔ شرفا ان ابتر حالات کے اندر اس حد تک پس چکے تھے کہ ان کے اندر اپنی تہذیبی روایات کو بچانے کی قوت دم توڑنے لگی۔ صاحبِ ضمیر سرکاری ملازم حکمرانوں کی چیرہ دستیوں سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے تحفظ کی خاطر عدل و انصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو "شاہ سے بڑھ کر شاہ کے خیر خواہ" ثابت کرنے کی کوشش کی — سماج دشمن عناصر نے بھٹو صاحب کے دورِ اقتدار کو غنیمت سمجھا اور پیپلز پارٹی کے سایہ میں پناہ لے لی۔ خود غرض سیاستدانوں نے "قائدِ عوام" کے منظورِ نظر بن کر ملکی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ اِدھر "قائدِ عوام" بھی ان آبرو باختہ لوگوں کی ان ساری حرکات کو بنظرِ استحسان دیکھتا رہا کیونکہ حکمرانی کا یہ ناپاک اصول اس کے پیشِ نظر تھا کہ کسی صاحبِ اقتدار کے رفقاءِ کار جس قدر زیادہ بدقماش، بے اصول اور بے ضمیر ہوں اسی نسبت سے اس کی کرسی زیادہ مضبوط ہوتی ہے کیونکہ اغراض کے بندوں کی مصاحبت میں اُسے کسی طرف سے اختلافِ رائے کا ڈر نہیں ہوتا۔

بعض سطح بین لوگوں کا خیال ہے کہ بھٹو صاحب نے دانستہ نہیں بلکہ محض اپنے لاابالی پن میں ملک کے حالات کو بگاڑا ہے۔ مگر یہ ان حضرات کی کوتاہ اندیشی ہے۔ "قائدِ عوام" کی شخصیت کو بعض غیر ملکی طاقتوں نے ملک کے بے دین عناصر کی معاونت سے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت اُبھارا اور سازش کے ذریعے اسے ایوب خاں سے الگ کر کے پیپلز پارٹی بنوائی۔ پھر ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں انہوں نے مغربی پاکستان کے اندر اس کی پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے پوری طرح تگ و دو کی اور بالآخر شاہنواز بھٹو کے اس فرزندِ دلبند کو جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا، جس نے امریکہ اور انگلستان میں تعلیم و تربیت پائی، زرداروں کے جلو میں تخت و تاج کا مالک بنوایا۔ جس شخص کو اقتدار میں لانے کے لیے اتنے جتن کیے گئے ہوں وہ اگر لادین عناصر کے ناپاک ارادوں کی تکمیل نہ کرتا تو کیا کرتا؟

یہ "قائد عوام" کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں بے دینی عُریاں ہو کر اسلام کے خلاف ایک معاندانہ تحریک کے طور پر اُبھری ہے۔ اس نے تمام اسلام دشمن عناصر کو ایک مرکز پر جمع کیا ہے۔ انہیں دینِ حق کے خلاف کھلے طور پر ہرزہ سرائی کا موقع دیا ہے۔ بھٹو صاحب دراصل عوام کے قائد نہیں بلکہ لوگوں کی عفت و ناموس سے کھیلنے والے دین سے بیزار اور اخلاق سے عاری طبقوں کے مربی اور سرپرست ہیں۔ یہ طبقے اُن کی ذات میں اپنا آئیڈیل دیکھتے ہیں[1] کیونکہ ان کی عملداری سے لادین اور غنڈہ عناصر کو ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوتا ہے اور یہ عناصر بھٹو صاحب کی بے پایاں عنایات سے بہرہ ور ہونے والے نو دولتیے منہ زور ہو گئے ہیں اور وہ اپنی بقا اور معاشرے پر اپنے تسلّط کو قائم رکھنے کے لیے ہر قیمت پر "قائد عوام" کو تختِ شاہی پر براجمان دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ صورتِ حال دینی اعتبار سے اگرچہ بڑی اندوہناک ہے لیکن اس کا ایک فائدہ بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ مسلم معاشرے کے مار آستین کھل کر میدان میں آ گئے ہیں۔ ان کے منصوبوں، ان کے رنگ ڈھنگ اور جارحانہ عزائم سے دیندار طبقے بخوبی آگاہ ہوئے ہیں اور انہیں اس بات کا کسی حد تک احساس ہو گیا ہے کہ جب تک ان شر پسند عناصر کا زور توڑ نہیں دیا جاتا اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی آرزو، آرزو ہی رہے گی، شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکیگی۔ دوسری طرف الحاد کی قوتوں نے بھی حالات کی سنگینی کو اچھی طرح بھانپ لیا ہے اور وہ ہر اعتبار سے مسلح ہو کر یہ معرکہ سر کرنے کا تہیہ کر چکی ہیں۔ اس

---

[1] ان عناصر کو قائدِ عوام کی ذات سے کس قدر ذہنی اور جذباتی لگاؤ ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ایک جگہ پر چند نوجوان بھٹو صاحب کے محاسن و مناقب پر گفتگو کر رہے تھے۔ بحث کے دوران بھٹو صاحب کے حامی دلائل کے میدان میں بالکل عاجز آ گئے تو انہوں نے پُرجوش انداز میں کہا، تم اس پر ہمیں طعنہ دیتے ہو کہ ہم تھوڑی سی شراب پینے والے آدمی کو اپنا رہنما مانتے ہیں؟ بھٹو اگر ہمیں مندروں میں جا کر بتوں کی پوجا کرنے کا حکم دے تو ہم یہ کام بھی پوری خوش دلی سے کرنے کے لیے تیار ہیں اور ہر حال میں ان کا ساتھ دینے پر کمربستہ ہیں۔

فیصلہ کن مرحلہ پہ دینِ حق کے شیدائیوں کو اپنی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اِس ضمن میں اس حقیقت سے انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہونا چاہیے کہ پاکستان قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان معاذ آرائی ملک کی دو سیاسی جماعتوں کے درمیان آویزش نہیں بلکہ یہ دو متحارب نظریات کی جنگ ہے۔ اگر اس ملک میں اسلام کی عملداری قائم ہونی ہے تو پھر اشتراکیت، فسق و فجور اور جبر و تشدد کی کوئی گنجائش نہیں اور اگر معاذ اللہ یہاں اشتراکیت کو ایک غالب قوت کی حیثیت سے مسلط ہونا ہے تو پھر پاکستان کی سرزمین میں کوئی فرد بحیثیت مسلمان زندہ نہیں رہ سکتا۔

(بقیہ مطبوعات)

اسی انگریزی ایڈیشن کا اردو ترجمہ ہے۔

آسی ضیائی ایک صاحبِ علم اور صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ ان کا ترجمہ سادہ، دلکش اور سلیس ہے۔ وہ اس علمی کارنامے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہمارے مسیحی بھائیوں کو تعصب سے خالی ہو کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ راہِ ہدایت کے بے شمار نشانات ان کے سامنے واضح ہو جائیں گے۔ مسلمان اہلِ علم کے لیے بھی اس کا مطالعہ نہایت کارآمد اور معلومات افزا ثابت ہوگا۔